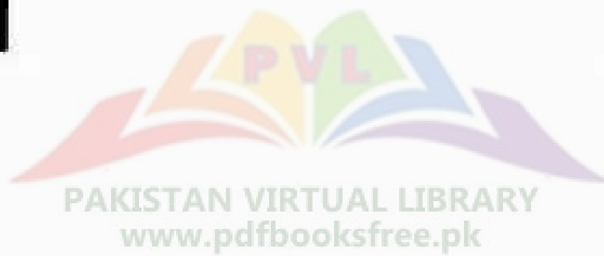
قیام پاکستان کے حقیقی اسباب

قیام پاکستان
کے
حقیقی اسباب



سید نظر زیدی
(سندِ امتیاز)



نظریۂ پاکستان ٹرسٹ

کتاب	:	قیامِ پاکستان کے حقیقی اسباب
مصنف	:	سید نظر زیدی (سندِ امتیاز)
ناشر	:	نظریۂ پاکستان ٹرسٹ
طابع	:	نظریۂ پاکستان پرنٹرز
مہتمم اشاعت	:	رفاقت ریاض
ڈیزائنر	:	مسز شازیہ احمد
کمپوزر	:	محمد شہزاد یٰسین
اشاعت سوم	:	Y2009
تعداد اشاعت	:	1000
قیمت	:	-/40 روپے

Published by
Nazaria-i-Pakistan Trust
Aiwan-i-Karkunan-i-Tehreek-i-Pakistan,
Madar-i-Millat Park, 100-Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore.
Ph. 9201213-9201214 Fax. 9202930 E-mail: trust@nazariapak.info
Web: www.nazariapak.info

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers,
10-Multan Road, Lahore. Ph: 7466975



ابتدائی کلمات

نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کی غرض و غایت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے مقاصد اور اس کیلئے دی جانے والی قربانیوں کو اُجاگر کیا جائے' نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت کی جائے اور اہلِ وطن بالخصوص نئی نسل کو پاکستان کی نظریاتی اساس اور عظیم تاریخی و تہذیبی ورثے سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کیلئے نظریۂ پاکستان ٹرسٹ ایک ہمہ جہت پروگرام پر عمل پیرا ہے جس میں مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ ان مطبوعات کے ذریعے ہم نئی نسل کو نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیرِ تحریکِ پاکستان کے افکار و تصورات کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں آگہی فراہم کر رہے ہیں اور ان میں اپنے ملک و قوم کے حوالے سے احساسِ تفاخر پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی قومی ذمہ داریوں سے زیادہ احسن انداز میں عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظمؒ کی بے لوث اور عہد ساز قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بیش بہا قربانیاں پیش کر کے اگرچہ پاکستان تو حاصل کر لیا مگر ہم اسے قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کے مطابق اسلامی نظریۂ حیات کا قابلِ تقلید نمونہ نہیں بنا سکے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ پاکستان اور قائداعظمؒ کی جدوجہد کے باعث اگرچہ ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط اور غلبے سے نجات حاصل ہو گئی مگر آج ہم ایک دوسری طرح کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گئے ہیں جس سے نجات کے حصول کے لئے ہمیں از سرِ نو قائداعظمؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ صرف اسی طرح ہم وطنِ عزیز کو ایک جدید اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت بنانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت تحریکِ پاکستان میں طلباء و طالبات نے ہر محاذ پر مسلم لیگ کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی شب و روز جدوجہد کے طفیل برصغیر کا ہر گوشہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے روح پرور نعروں سے منور ہو گیا تھا۔ بابائے قوم نے بارہا ان کی خدمات کو سراہا تھا اور ان پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "یہی ہیں وہ مردانِ عمل جو آئندہ ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھائیں گے۔" مجھے قوی اُمید ہے کہ زیرِ نظر تصنیف کا مطالعہ ہماری نئی نسل میں اس عقابی روح کو بیدار کر دے گا جو تحریکِ پاکستان کا طرۂ امتیاز تھی اور وہ نظریۂ پاکستان کی مبلغ بن کر پاکستان کو علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات سے رہائی دلا کر وطنِ عزیز کی کشتی ساحلِ مُراد تک پہنچائے گی۔

مجید نظامی

(مجید نظامی)

چیئرمین

فہرست

ابتدائیہ

جب متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی تھی تو ہندو کانگرس کہا کرتی تھی کہ اول تو ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں اور اگر مسلمانوں کے نزدیک یہ مسئلہ ہے بھی تو یہ ہمارا داخلی معاملہ ہے جسے ہم انگریزوں کی ہندوستان سے واپسی کے بعد خود حل کرلیں گے۔ مسٹر گاندھی ہندو کانگرس کے اس منافقت انگیز تصور کے سب سے بڑے پرچارک تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہندو مسلم مسئلہ مصنوعی طور پر پیدا کر رکھا ہے۔ بظاہر یہ الفاظ بڑے خوشنما دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر اس خوشنمائی کی منافقت کا پردہ چاک کر دیا جائے تو اس کے اندر ایک ایسا گھناؤنا اور بھیانک چہرہ دکھائی دیتا ہے جسے دیکھ کر انسانیت کے حواس گم ہو جاتے ہیں۔ جب انگریز 1947ء میں ہندوستان سے رخصت ہو گئے تو اہنسا کے پرچارک مسٹر گاندھی نے اپنے منافقانہ تصور کی بنیاد پر ہندو مسلم مسئلہ حل کرنے کی بجائے اپنی قوم کے ذریعہ مسلمانوں کو آزادی کا پہلا تحفہ ان کی لاتعداد لاشوں کی شکل میں دیا اور یوں ہندوؤں نے خود ہی اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پاکستان کی مخالفت محض اس لیے کرتے تھے تاکہ وہ حصول آزادی کے بعد مسلمانوں کو اپنا تابع مہمل بنا کر رکھ سکیں۔ اگر ہندو کانگریس کے اس تصور میں صفر فیصد بھی صداقت ہوتی کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد یہ مسئلہ خود حل کر لیا جائے گا تو وہ حصول آزادی کے بعد مسلمانان برصغیر کے ساتھ بہیمانہ وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک

نہ کرتے جو آج تک جاری ہے۔ ان کی حصول آزادی کے بعد کی کارکردگی سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا اصل مقصد مسلمانوں کے ساتھ کوئی باعزت تصفیہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ برصغیر کے مسلمان آزادی کے بعد انگریزوں کی غلامی سے نکل کر ان کی محکومیت میں آ جائیں تاکہ وہ ان پر مستقمانہ انداز میں راج کر سکیں۔ اسی مقصد کے لیے مسٹر گاندھی مولانا حسرت موہانی کی ان قراردادوں کو کانگریس کے جلسوں میں منظور نہ ہونے دیتے تھے جن میں ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کی بات کی جاتی تھی کیونکہ کانگرس ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہندوستان کے لیے صرف داخلی خودمختاری کی حامی تھی تاکہ مسلمانوں پر حکمرانی کے لیے انگریزوں کی سنگین استعمال کر سکے لیکن قائداعظمؒ کی سیاسی بصیرت نے ہندو کانگرس کی منافقت کی بساط لپیٹ کر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے پاکستان کے نام سے علیحدہ آزاد ملک حاصل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے نہ صرف مسلمانوں کو ہندو کے تسلط سے بچا لیا بلکہ برصغیر کی سیاست کا رخ بھی تبدیل کر دیا۔ سید نظر زیدی سندِ امتیاز نے اپنے مضمون "قیام پاکستان کے حقیقی اسباب" میں اسی مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن حاصل کرنے کی ضرورت آخر کیوں محسوس ہوئی تھی اور مفکر اسلام علامہ محمد اقبالؒ نے برصغیر کے ہندو مسلم مسئلے کا حل مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کو کیوں قرار دیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ اس مضمون میں اس مٹھی بھر عنصر کو بھی اپنا چہرہ نظر آ جائے گا جو آج بھی کہتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے لیے علیحدہ وطن حاصل نہیں کرنا چاہئے تھا۔

☆☆☆

قیام پاکستان کے حقیقی اسباب

ہمارے پڑوسی بھارت کی طرف سے ان دنوں بھی یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان پاکستان کا مطالبہ کر کے ملک تقسیم نہ کراتے تو برصغیر ان مصائب میں مبتلا نہ ہوتا جن کی وجہ سے آزادی ایک طرح کی سزا بن گئی ہے۔ آزادی سے پہلے ہندو قیادت بہت زور دے کر یہ کہتی تھی کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کا مطالبہ انگریزوں کی شہ پر کیا ہے اور اس کا مقصد ملک کی آزادی کو التوا میں ڈالنا ہے۔ اب "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق ہندو عصبیت کے نمائندے تمام حالات کی خرابی کا سبب قیام پاکستان بتاتے ہیں۔

خدا کے فضل سے پاکستان ایک حقیقت ہے اور حضرت قائداعظمؒ کے قول کے مطابق قیامت تک قائم رہنے کے لیے بنا ہے لیکن ہندو قوم اپنی خاص ذہنی ساخت اور خاص سیاسی اغراض کی وجہ سے اس سورج جیسی روشن سچائی کو آج بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ سابق وزیراعظم بھارت واجپائی صاحب سابق وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کی دعوت پر لاہور آئے تھے تو انہوں نے برملا کہا تھا کہ ہم ملک تقسیم ہونے کے صدمے کو ابھی تک نہیں بھولے۔ یہ صدمے کو نہ بھولنے کی بات دراصل اس خبط کی وجہ سے ہے جو ہندو نے رام راج قائم کرنے کی خواہش کی صورت میں اپنے اوپر طاری کیا تھا۔ اس کی یہ نا روا خواہش علاقے کی ایک بالا قوت بن جانے کے عزم کی صورت میں کچھ اور قوی ہوئی ہے اور برصغیر کو لپیٹ میں لے لینے والے جملہ مصائب کا اصل سبب یہی ہے۔

کشمیر میں جو خونریزی ہو رہی ہے اس کا باعث بھی یہی ذہنیت ہے۔ بھارت میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اسی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ بابری مسجد شہید کر دیئے جانے کا سانحہ بھی اس کی وجہ سے رونما ہوا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں پڑوسی

ملک ایٹمی جنگ کے خطرے تک بھی اسی کی وجہ سے پہنچے ہیں۔ اگر ہندو یہ بات سمجھ لیتے کہ اس ملک میں بسنے والے کروڑوں مسلمان بھی اسی طرح اس کے باشندے ہیں جس طرح وہ خود ہیں تو سرے سے کسی طرح کا نزاع پیدا ہی نہ ہوتا لیکن انہوں نے حقائق کو جھٹلایا اور انگریزوں کی سازش کے جال میں پھنس کر آزادی کو ایک نوعیت کی بربادی بنالیا۔

اس سلسلے میں ایک بہت ہی افسوسناک بات یہ بھی ہے کہ بعض گمراہ مسلمان بھی قیام پاکستان اور ملک کی تقسیم کو حالات کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھتے۔ مندرجہ ذیل سطور میں تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندو مسلم تنازعات کی صورت میں اس ملک کے بڑے الجھے ہوئے مسائل کا سب سے اچھا حل پاکستان کا قیام ہی تھا۔ یہ بات کل بھی درست تھی اور آج بھی درست ہے بلکہ اب تو اس کا مبنی برحق ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا ہے۔ آزادی کے گزشتہ 59 برسوں میں ہندو کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ آیئے یہ بات حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

مسلمانوں سے عناد کی وجہ:

آزادی حاصل کرنے کے بعد بھارت کی حکومت اور عوام کے ایک طبقے نے پاکستان اور بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف تشدد، دروغ گوئی اور نفرت کا جو رویہ اختیار کیا' اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا اصل سبب وہ عناد ہے جو صدیوں سے اس ملک کے ہندو کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا لیکن اس سلسلے میں بھارتی قیادت' متعصب عوام اور ان کے سیاسی حمایتیوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ جو کچھ ہوا' وہ فطری عوامل کا نتیجہ ہے بلکہ اس سے بھی آگے جا کر یہ ارشاد فرمایا گیا کہ قصور صرف پاکستان اور ان بھارتی مسلمانوں کا ہے جنہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ بھارت کا ہندو تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ اس غلط پروپیگنڈے کا پول کھولا جاتا اور مدلل انداز میں دنیا کو یہ بتایا جاتا کہ بھارت میں جو کچھ ہو رہا ہے' وہ بھارتی ہندوؤں کے مذہبی جنون اور غیر

متوقع طور پر میسر آ جانے والی طاقت کے نشے میں بدمست ہو جانے کے سوا اور کچھ نہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس انداز سے سوچا ہی نہیں جاتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہمارے نزدیک عالمی رائے عامہ کی کوئی اہمیت نہیں جبکہ موجودہ حالات میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ ہم اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو بالکل صحیح حالات سے آگاہ کریں اور یہ بتائیں کہ بھارت میں رونما ہونے والے مسلم کش فسادات ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہیں اور ان کا مقصد مسلمانوں کی نسل کشی اور انہیں زندگی کے اعلیٰ اداروں سے خارج کرنا ہے۔ عالمی سطح پر ہمیں اب تک جو نقصان پہنچا ہے' اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا یہ قریبی ہمسایہ جو اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث بہت سی الجھنوں میں پھنسا ہوا ہے اور اپنے طور پر ہمیں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھ بیٹھا ہے' اپنی اس مہم میں بہت کامیاب رہا کہ شرمناک مظالم کا ارتکاب کرنے کے باوجود دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ برصغیر میں جو تباہی آئی' اس کا ذمہ دار صرف مسلمان ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس فریب کا پردہ چاک کیا جائے۔ یہ سطور اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ خود ہندو کے دل میں مسلمانوں کے خلاف یہ عناد کیوں پیدا ہوا؟ ہمارے نزدیک اس کے یہ اسباب ہیں:

1- جب یہاں انگریز آیا تو اس کے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے اس ملک کے ہندو نے غیر مشروط طور پر انگریز کے ساتھ تعاون کیا اور انگریز نے اس کا انعام یہ دیا کہ اپنے دفتری نظام میں ہندو کو ہیڈ کلرک کا درجہ دے دیا۔ دیگر اقتصادی امور میں بھی اسے بالادستی بخشی اور اس پالیسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ کچھ ہی عرصے میں ہندو اُن مسلمانوں کے مقابلے میں مضبوط ہو گئے جو انگریزوں سے پہلے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے اور اسی توانائی نے نسلی تفوق کے جذبے جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھا کو اور قوی کر دیا۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کمزور کر کے وہ اپنے اس جذبے کی تسکین چاہتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے موقع پر اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ آج ہم نے ایک ہزار

سال کی ذلت کا بدلہ لے لیا اور یہ وہ بات تھی جسے ہندو صدیوں سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔

2- انگریزوں نے اپنی رسوائے زمانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے مطابق تاریخ کی ایسی کتابیں درسی نظام میں شامل کیں جن میں ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کی فرضی داستانیں درج کی گئی تھیں۔ ان کتابوں نے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غصہ پیدا کیا جس کے اظہار کا اسے اب موقع ملا ہے۔

3- ہندو اگرچہ ان معنوں میں خود بھی غیر ملکی تھے کہ وہ وسط ایشیا سے آئے تھے اور اس ملک کے اصل باشندوں کو شکست دے کر اس پر قابض ہو گئے تھے لیکن مسلمانوں کے بارے میں ان کا تصور یہی رہا کہ وہ غیر ملکی ہیں اور اس ملک پر جبری طور پر قابض ہو کر یہاں حکومت کرتے رہے ہیں۔ اجنبیت کا یہ احساس اس وجہ سے بہت گہرا تھا کہ مسلمانوں کا دین' تمدن اور زبان وغیرہ ہندوؤں سے نمایاں طور پر جدا اور ممتاز تھے۔

4- ہندو ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے محکوم رہے اور یہ احساس انہیں غیر شعوری طور پر احساس کمتری میں مبتلا کرتا اور انتقام پر اکساتا تھا۔ اب طاقت ملی تو وہ بے قابو ہو گئے۔

5- ہندو مذہب کے ماننے والے اگرچہ بتوں کے علاوہ درختوں' دریاؤں' جانوروں اور انسانوں تک کی پوجا کرتے ہیں اور بہت سی ناپاک چیزیں ان کے نزدیک پاک ہیں جیسے گائے کا گوبر اور پیشاب لیکن ان کے قدیم برہمن رہنماؤں نے ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ ان کا درجہ عام انسانوں سے بہت بلند ہے۔ نسلی تفوق اور برتری کا یہ عقیدہ وہ کچھ ایسی شدت سے اپنائے ہوئے ہیں کہ انہوں نے کروڑوں انسانوں کو اچھوت قرار دے کر انتہائی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان کے رہنماؤں نے مسلمانوں کو بھی ملیچھ ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس تحریک کے نتیجے میں بھی ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہوئی۔

6- بہت سے ذی اثر ہندو رہنماؤں نے اس وہم کو ہندو عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا کہ

مسلم برادری جنگجو اقوام پر مشتمل ہے۔وہ جب بھی طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے' پہلے کی طرح ہندوؤں کو اپنا غلام بنا لیں گے۔

اس سلسلے میں کچھ اور وجوہ بھی ہیں لیکن مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔خلاصہ کلام یہ کہ جس زمانے میں ہندوستان کے آزاد ہونے کے امکانات روشن ہوئے' ہندوؤں کی اکثریت خود کو اس ملک کا اصل وارث اور مسلمانوں کو بدیشی خیال کرتی تھی۔اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد یہاں رام راج قائم کریں گے اور اس رام راج میں مسلمانوں کے لیے واحد راستہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ شدھ ہو کر ہندو قوم کا حصہ بن جائیں یا ہجرت کر کے اپنے مکہ مدینہ چلے جائیں۔

یقیناً یہ فیصلہ احمق ہندوؤں کا تھا لیکن بدنصیبی کی بات یہ ہوئی کہ جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آتی گئی' ایسے ہی یا ان سے ملتے جلتے خیالات ان ہندوؤں کے دلوں میں بھی جگہ پاتے چلے گئے جو خود کو روشن خیال' دیش بھگت' سیکولر اور نیشنلسٹ اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہتے تھے۔یہاں تک کہ ان کے سب سے بڑے ''دیش بھگت'' مہاتما گاندھی بھی اس سے نہ بچ سکے۔

ایک بہت بڑی غلطی:

اس حوالے سے اتنے مغالطے پیدا کیے گئے ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی' اس لیے مشتے از خروارے کے طور پر یہاں صرف ایک ایسی بات کا حوالہ دیا جا رہا ہے جس سے اس ہندو ذہن کی کھل کر عکاسی ہوتی ہے جس نے ہندوستان کی سیاست پر بہت گہرا منفی اثر ڈالا۔وہ ہندی زبان کی ترویج کا منصوبہ تھا۔تاریخ کا ہر طالب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں عدالتوں اور سرکاری دفاتر کی زبان فارسی تھی اور اسے یہ مرتبہ اس وجہ سے حاصل ہوا تھا کہ فارسی بولنے والے مسلمانوں نے اس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا۔ابتدائی زمانے میں یہ مسلمان اپنے خاص تمدن کے بھی بہت شیدائی تھے اور اپنے دین کی بات بھی بغیر کسی ابہام کے کرتے تھے'

پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا وہ اس ملک میں بسنے والے غیر مسلموں سے مانوس ہوتے چلے گئے اور بغیر کسی کوشش کے یہاں ایک ایسا تمدن اور ایک ایسی زبان متشکل ہوگئی جس پر مسلموں یا غیر مسلموں میں سے کسی کی بھی چھاپ نہ تھی۔ یہ زبان اردو تھی اور اس تمدن کو بھی بہت آسانی سے اردو کلچر کہا جاسکتا ہے۔

یہ زبان اور یہ تمدن چونکہ فطری تقاضوں کی بنا پر معرض وجود میں آیا تھا' اس لیے اس میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو اس ملک کے تمام مہذب باشندوں کے لیے قابل قبول تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وسیع ملک میں لگے بندھے ضابطوں کے مطابق کوئی ایک زبان کبھی بھی نہیں بولی گئی اور نہ ہی سب علاقوں کے رہن سہن اور طور طریقے ایک جیسے رہے۔ بہت سے علاقوں میں تو آج بھی انسانوں کی کثیر تعداد ایسی زندگی بسر کر رہی ہے جسے تہذیب اور تمدن سے برائے نام ہی واسطہ ہے لیکن یہ عجیب بات بہر حال ضرور ہوئی کہ وہ مرکزی خطہ جو پورے ملک کے انتظامات سنبھالے رکھتا ہے' اردو کلچر اور اردو زبان کے زیر اثر آ گیا۔ ہندو اور مسلمان مشترکہ بستیوں' بلکہ گلی محلوں میں مل جل کر زندگی گزارتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ یہ کلچر مسلمانوں کی بے مثال رواداری کا عطیہ تھا۔

یہ پاکیزہ اور بابرکت فضا اس وقت مکدر ہوئی جب سات سمندر پار سے آیا ہوا انگریز اس ملک پر قابض ہوا اور وہ بھی اس کی اس پالیسی کی وجہ سے کہ اس ملک کے سابق حکمران مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے لیے وہ ہندوؤں کو ان کے خلاف اکساتا رہا۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ برصغیر ہند میں سب سے پہلا ہندو مسلم فساد 1906ء میں بنارس میں ہوا۔ اس سے پہلے ایسے منحوس سانحے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ رونما ہو بھی نہ سکتا تھا کیونکہ مسلمان اس ملک کے حاکم تھے اور انہوں نے ہندوؤں کو اس طرح دبا رکھا تھا کہ وہ چوں بھی نہ کر سکتے تھے لیکن یہ بات یوں غلط ہے کہ شہنشاہ اکبر کے بعد سے صورت حال کچھ یوں بدلی کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں

ہندو مسلمانوں سے بالا دست ہو گئے تھے' بلکہ اس سے بھی آگے خصوصاً مذہبی معاملات میں ان کا اثر و رسوخ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ مسلمانوں نے بہت رغبت سے ان کی بہت سی رسمیں اور رواج اپنا لیے تھے اور وہ فرق مٹ گیا تھا جو حاکم اور محکوم میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں طالع آزما ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کے مابین کچھ لڑائیاں ضرور ہوئیں لیکن یہ لڑائیاں اس لیے نا قابل توجہ ہیں کہ اقتدار کی ایسی کشمکش تو خود مسلمانوں کے مابین بھی ہوتی رہی اور ہندو ہندو اور سکھ' سکھ بھی آپس میں لڑتے رہے۔ اس دور کے پرسکون اور سب کے لیے منصفانہ ہونے کا ایک یہی ثبوت کافی ہے کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے باوجود اس ملک میں غیر مسلم اکثریت میں رہے۔ انہوں نے اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزاری اور انہیں اپنے طور طریقوں کے مطابق عبادت کی پوری آزادی حاصل رہی۔ وہ جہاں بھی آباد تھے' ان کی عبادت گاہیں موجود تھیں جو آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں شاید ایک بستی بھی ایسی نہ ملے گی کہ وہاں ہندو آباد ہوں اور ان کا مندر نہ ہو۔

ممکن ہے یہ انگریزوں کے اکسانے پر ہوا ہو یا کسی اور وجہ سے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس پُرسکون اور منصفانہ ماحول کو خراب کرنے کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہوا اور جب اس کا آغاز ہو گیا تو پھر یہ خرابی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ قیاس کہتا ہے یہ ہنگامے اس لیے بھی شروع ہوئے کہ نیا خون ملنے کے باعث ہندوؤں نے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اردو کلچر اور اردو زبان کو قرآنی کلچر اور قرآن کی زبان قرار دے کر مسلمانوں کے خلاف بہت منظم طریقے سے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مثلاً 1900ء میں یو پی کے ہندوؤں نے اس صوبے کے ہندو نواز انگریز گورنر انٹونی میکڈانل کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ اردو کی جگہ ہندی کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ صوبے کی سرکاری زبان بنایا جائے اور اس نے یہ مطالبہ تسلیم کر کے 18 اپریل 1900ء کو ایک حکم نامہ جاری کر دیا۔ گزشتہ پچھتر برسوں سے اردو اس وسیع صوبے کی سرکاری زبان چلی آ رہی تھی اور یہ اپنے مزاج' اپنے رچاؤ اور مٹھاس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں سب میں

بہت مقبول تھی جبکہ ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کی حیثیت خالص مذہبی تھی۔ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ بالیقین اس لیے کیا گیا تھا کہ ہندو اپنے مذہب اور اپنے کلچر کا غلبہ چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ یہ قیاس نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اس کا ثبوت اس طرح فراہم ہوا کہ ہندی زبان کی ترویج پوری ہندو قوم کا مطمح نظر بن گئی اور اس تحریک کے قائد خود مسٹر گاندھی ٹھہرے۔ یہ داستان بھارت کے پہلے صدر راجندر پرشاد نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''اپنی کہانی'' میں بہت تفصیل سے لکھی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ہم میں سے کچھ کے دل میں خیال گزرا کہ اکھل بھارت واسنہ ہندی ساہتیہ سمیلن بھی ہونا چاہئے اور اس مضمون کے مقالے لکھے گئے۔ ہندی کے خادموں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور کاشی میں پہلا اجلاس ہوا۔ میں بھی اس میں موجود تھا اور محترم مالوی جی صدر ہوئے۔ اس سمیلن کے ساتھ میرا تعلق اس کی ابتدا ہی سے رہا۔'' (اپنی کہانی صفحہ 161-162)۔

مسٹر گاندھی کے اس تحریک سے وابستہ ہونے اور اس کی سرپرستی کرنے کے بارے میں راجندر پرشاد نے لکھا ہے:۔

''گجرات' مہاراشٹر' بنگال' آسام وغیرہ صوبوں میں پرچار کا کام کرنے کا بار اس راشٹریہ بھاشا پرچار سمیتی کو سونپا گیا۔ میں اس کا صدر بنا مگر رہنمائی کا کام گاندھی جی نے لے لیا اور رقم جمع کرنے کی سیٹھ جمنا لال بجاج نے۔ اس سمیلن کے کئی اشخاص پرشوتم داس ٹنڈن' پنڈت ودیا شنکر دوبے' بابو رام سکسینہ وغیرہ ممبر بنائے گئے۔ کچھ غیر ہندی صوبوں کے نمائندوں کے روپ میں وہیں کے ہندی پریمی شامل ہو گئے۔ یہ سمیتی تین سال کے لیے بنائی گئی تھی مگر تین سال گزرنے پر پھر مقرر کر دی گئی۔ 1936ء سے 1942ء تک چھ برسوں میں اس سمیتی نے غیر ہندی صوبوں میں خاص کر گجرات اور مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کے مرہٹہ ضلعوں اتکل اور آسام میں بہت کام کیا۔ طالبعلموں کے لیے کتابیں لکھوائیں۔ امتحان لیے اور پاس بھی ہوئے۔ سیٹھ پدم پت سنگھانیہ نے پانچ برسوں تک پندرہ ہزار روپے سالانہ کل پچھتر ہزار روپے کا دان دے کر اس کی مالی دشواریوں کو بہت حد

تک دور کر دیا۔ کاکا کالیکر، سیٹھ نارائن شری من نارائن اور دادا دھنیا ادھیکاری نے بہت جذبے اور جوش سے گاندھی جی کے سایۂ عاطفت میں اسے ایک جامع اور موثر بلند مرتبہ جماعت بنا دیا۔'' (میری کہانی صفحہ 765)۔

ہندو کلچر کا احیا:

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بھی بڑی زبان صرف زبان نہیں ہوتی بلکہ کسی نہ کسی خاص تمدن سے وابستہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اردو زبان کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک خاص تمدن بھی لائی یا جیسے انگریزی زبان نے برصغیر میں ایک خاص کلچر کو جنم دیا۔ اس کلیئے کے مطابق ہندی بھی ہندوؤں کے اس خاص تمدن کی نمائندہ تھی جسے دیو مالائی کلچر کہا جاتا ہے۔ اس زبان کو ترقی دینے سے ہندوؤں کا اصل مقصد بھی اس کلچر کا احیا ہی تھا اور یہ ایسی بات نہ تھی جسے مسلمان محسوس نہ کرتے چنانچہ انہوں نے ہندوؤں کی ان سرگرمیوں کا شدت سے نوٹس لیا اور سب سے پہلے سرسید اور نواب محسن الملک نے گورنر کے اس فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ نواب صاحب گورنر سے ملاقات کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتے تھے لیکن شاید یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی پالیسی کا ہی ایک حصہ تھا کہ گورنر نے وفد کو ملاقات کا موقع نہ دیا اور اپنے سیکرٹری سے جواب لکھوا دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔[2]

یہ مسلمانوں کی غیرت کے لیے کھلا چیلنج تھا۔ چنانچہ انہوں نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں احتجاجی جلسے کیے اور صوبے کے دیگر مقامات پر بھی سخت احتجاج کیا گیا۔ لازم تھا کہ یہ انگریز گورنر اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتا لیکن اس نے الٹا مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی۔ وہ علی گڑھ آیا ٹرسٹیوں کا اجلاس طلب کیا اور اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اگر نواب صاحب اس تحریک سے الگ نہ ہوں گے تو کالج کی گرانٹ بند کر دی جائے گی۔ نواب صاحب اس فرعونیت کے جواب میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ گو بعد میں انہوں نے اپنے رفقاء کی یہ بات مان لی کہ وہ اس نازک دور میں کالج سے علیحدہ نہ ہوں لیکن ان

کے رویے سے یہ بات بہر حال ثابت ہوگئی کہ ہندی کو یوپی کی سرکاری زبان تسلیم کرنے سے انہیں شدید رنج ہوا۔

ہندوؤں اور انگریز گورنر کی اس ملی بھگت سے مسلمانوں کے بہت زیادہ پریشان ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ انہی دنوں نواب محسن الملک نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کے طور پر انجمن ترقیٔ اردو کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اردو زبان کی ترویج اور حفاظت کے لیے ایک زبردست تحریک بن گئی۔

دوسری طرف ہندوؤں کے ذی شعور طبقے نے بھی محسوس کیا کہ اردو زبان کو پچھاڑ کر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کی کوشش کوئی ایسی بات نہیں جسے مسلمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیں گے لیکن افسوس کہ انہوں نے اس فساد کو روکنے کا جو حل تجویز کیا' وہ موثر ثابت نہ ہوا اور ہو بھی نہ سکتا تھا کیونکہ اس کی مثال تو اس کہاوت کے مطابق تھی کہ: "پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر لیکن پرنالہ وہیں گرے گا"۔

اور اس سلسلے میں بہت زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کام بھی "دیوتا سروپ" گاندھی جی کی سرپرستی میں ہوا۔ مسلمانوں کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر ہندی زبان کے ان حامیوں نے بہت منظم طریقے سے دو کوششیں کیں۔ ایک تو یہ کہ مسلم رائے عامہ کے اشتعال اور شدت کو کم کیا جائے اور ان کی صفوں میں سے ایسے لوگ توڑ لیے جائیں جو ہندی زبان کو رائج کرنے کے فیصلے پر انگوٹھا لگا دیں۔ دوسرے یہ کہ نام اور اس کا مقصد تو وہی رہے جو ان کے پیش نظر ہے لیکن تحریک کا رخ کچھ بدل دیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان بھی راجندر پرشاد کی زبانی ہی بیان کی جائے۔ اس کانگرسی رہنما نے لکھا ہے:۔

"ناگپور میں ایک اور سمیلن ہوا۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ اردو اور ہندی کا آپس میں جھگڑا بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان دونوں میں ہم آہنگی کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ایک ایسی انجمن کی ضرورت تھی جس میں دونوں زبانوں کے عالم شامل ہوں اور جو

بغیر کسی کھینچا تانی کے صرف زبان کی ترقی کے مقصد کے لیے کام کریں۔ انہوں نے اس میں کنہیا لال منشی کو جو گجراتی ادیبوں میں اونچا مقام رکھتے تھے لگانا چاہا۔ منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق[3] سے بھی مدد لینی چاہی۔ اس انجمن (راشٹریہ پریشد) کا اجلاس ناگپور میں منعقد کیا گیا۔ اس جلسے میں مولوی عبدالحق کا اختلاف ہو گیا۔ انہوں نے جلسے کے بعد کچھ ایسے مضمون لکھے جن میں مسٹر گاندھی پر حملہ کیا گیا۔ اس لیے پریشد مسلمانوں کی حمایت نہ کر سکی اور منشی پریم چند اور کنہیا لال نے کاشی کے ہندی ماہنامے "ہند" کو پریشد کی طرف سے کچھ دنوں تک چلایا"۔ (میری کہانی۔ صفحہ 765) یہ حملہ کیا تھا یہی کہ مولوی عبدالحق نے اس منافقت کا پردہ چاک کیا ہوگا کہ کام تو ہندی زبان کو ترقی دینے اور ہندو قوم کو حاکم اعلیٰ بنانے کا کیا جائے اور اس کا نام قومی خدمت اور خدمت انسانیت رکھا جائے۔

ایک مغالطہ:

دوسری کوشش اس سلسلے میں یہ کی گئی کہ جب مسلمان ہندی زبان کے رواج پا جانے کی صورت میں ہندو دیومالائی کلچر کے مسلط ہو جانے کے خطرے کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو اس زبان کا نام ہندی کے بجائے ہندوستانی رکھ دیا گیا اور ان مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے جو اپنے جذبہ حُبُّ الوطنی اور حریت پرستی کے باعث کانگرس سے وابستہ ہو گئے تھے ایک مغالطہ یہ دیا گیا کہ کانگرس کے آئین میں جہاں زبان کا ذکر آیا ہے ہندی زبان کا یہی نام یعنی ہندوستانی لکھا گیا۔ راجندر پرشاد لکھتے ہیں:۔

"کانگرس کے آئین میں جہاں زبان کا ذکر ہے وہاں نہ لفظ ہندی استعمال کیا گیا ہے نہ اردو بلکہ وہاں لفظ ہندوستانی استعمال ہوا ہے"۔ (میری کہانی صفحہ 757)۔

یہاں اس بات پر اصرار کرنے کی ضرورت نہیں کہ کانگرس کے آئین میں ہندی کے بجائے ہندوستانی صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی دردِ دل رکھنے والے کی تجویز ہو اور اس کا تصور یہ ہو کہ جو ہندو اردو زبان کی مخالفت کر رہے ہیں اور جو مسلمان ہندی کو خطرے کی علامت خیال کرتے ہیں وہ ہندوستانی نام دیئے جانے

سے مطمئن ہو جائیں اور یہ خیال کریں کہ جو زبان ملک کے طول و عرض میں بولی جارہی ہے' اس کو ہندوستانی کا نام دے دیا جائے' اردو یا ہندی نہ کہا جائے۔

یہ صورت اگر باقی رہتی تو یقیناً ایک بہت ہی مبارک بات ہوتی۔ آل انڈیا کانگرس کا یہ فیصلہ ہندو اور مسلمان دونوں بخوشی قبول کرتے کیونکہ اس میں دونوں کی تالیف قلب کا سامان تھا' لیکن ہوا یہ کہ جب ملک آزاد ہوا اور اس فیصلے پر عمل کرنے کا وقت آیا تو کانگرس کے آئین میں تبدیلی کر کے ہندوستانی کی جگہ زبان کا نام ہندی ہی لکھا گیا اور یقیناً یہ سب کچھ مسٹر گاندھی کی منظوری سے ہی ہوا۔

آزاد بھارت میں زبان کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر لمبی چوڑی بحث کی جاسکتی ہے لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ہندو قوم نے مسٹر گاندھی کی سرپرستی میں زبان کا مسئلہ ان ہی مقاصد کے مطابق طے کیا جو 1900ء میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کرانے کے وقت پیش نظر تھے۔

برصغیر کو آزاد ہوئے تقریباً 59 برس بیت چکے ہیں اور اردو زبان اس ملک میں آج بھی اسی طرح مقبول ہے جس طرح پہلے تھی لیکن بھارتی ذرائع ابلاغ' ریڈیو' ٹیلی ویژن اور اخبارات و رسائل اس مشکل ترین زبان کو رواج دینے میں مصروف ہیں جسے ہندو بھی مشکل ہی سے سمجھتے ہوں گے اور جسے ہندوؤں کی مذہبی زبان کے سوا کوئی اور نام دیا ہی نہیں جاسکتا۔

یہ فیصلہ اور یہ طرز عمل ان مقاصد سے کھلا انحراف ہے جو آزاد بھارت کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ ہندی زبان کے ساتھ ہندو دیو مالائی کلچر پھیلانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔ درسی کتابیں دیوی دیوتاؤں کے ذکر اور تصاویر سے بھر دی گئی ہیں (جن میں ہاتھی کی سونڈ والے گنیش اور بندر کی دم والے ہنومان بھی ہیں) لیکن بھارتی قیادت کے نزدیک یہ سب کچھ انصاف اور سیکولرازم کے مطابق ہے۔

پرانی تمنا کی تکمیل:

بھارتی قیادت اگرچہ اس کا اقرار نہیں کرتی لیکن بھارت میں ہندوازم کے فروغ کے

لیے جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل ہندو قیادت کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہے۔ ہوا یہ کہ انگریز کی طے شدہ پالیسی کے نتیجے میں جب ہندو تجارت سے تعلیم تک ہر میدان میں مسلمانوں سے بالا دست ہو گیا اور پھر مسلمانوں کی شروع کی ہوئی تحریک آزادی کے نتیجے میں یہ امکان بھی روشن ہونے لگا کہ بالآخر غیر ملکی حکمرانوں کو یہاں سے جانا ہو گا تو ہندوؤں نے یہ تیاری شروع کر دی کہ انگریزوں کے بعد اس ملک کی حکومت ان کے ہاتھوں میں آئے اور پھر وہ اسے اپنے خاص مذہبی مزاج کے مطابق چلائیں۔

اس سلسلے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پیدا کی گئی ہے کہ فرقہ پرستی کی بات مسلمانوں نے شروع کی۔ ہندو قائدین اس بارے میں مسلم لیگ کو بہت بدنام کرتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تحریک خلافت سے پہلے بھی مسلمانوں کا سیاسی موقف بہت واضح طور پر یہ تھا کہ ملک آزاد ہو تو اس کے تمام باشندوں کو بالکل یکساں حیثیت میں آزادی ملے۔ انہوں نے تو اپنی حکومت کے زمانے میں بھی یہ رواداری برتی تھی کہ ہندوؤں کو کاروبار حکومت میں برابر کا شریک ٹھہرایا تھا اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اپنا خاص اسلامی تمدن اور اپنی قومی زبان ترک کر کے خالص ہندوستانی کلچر اور اردو زبان اختیار کر لی تھی۔ اگر ان کہانیوں کو درست تسلیم کر لیا جائے جو ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کے عنوان سے گھڑی گئی تھیں تو مسلمانوں کے ہزار سالہ طویل دور حکومت میں اس ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت کو اسلام قبول کر لینا چاہیے تھا اور ہندو کلچر کا ایک بھی نشان باقی نہ رہنا چاہیے تھا لیکن اس ملک کی بستیاں آج بھی یہ گواہی دیتی ہیں کہ ہندو اکثریت میں رہے اور انہیں اپنے قومی اور مذہبی امور میں کامل آزادی حاصل رہی۔

مسلمانوں کی فتوحات کے ابتدائی دور میں بے شک یہ جذبہ تازہ تھا کہ اس ملک کے باشندوں کو اسلام سے آشنا کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محمد بن قاسمؒ، محمود غزنویؒ اور محمد غوریؒ کی یلغار بڑی حد تک جذبۂ جہاد ہی کی مرہون منت تھی۔ یہ جذبہ خاندانِ غلاماں تک زندہ رہا لیکن اس کے بعد تو جن مسلمانوں نے اس ملک پر حکومت کی وہ عام فاتحین کی طرح

اپنی خاندانی حکومتیں قائم کرنے کی دُھن میں مست رہے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اس بات پر ذرا دھیان نہ دیا کہ مدمقابل ہندو ہے یا مسلمان۔ مثال کے طور پر بابر نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو پہلا معرکہ ابراہیم لودھی سے ہوا جو یقیناً مسلمان تھا۔ اسی طرح اگر اکبر مہارانا پرتاپ سے نبرد آزما رہا تھا تو اس کی تلوار ایسے مسلمانوں کے خون میں بھی ڈوبتی رہی جو اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بنے۔ کیا وہ اپنے چہیتے بیٹے نورالدین جہانگیر کے خلاف معرکہ آرا نہ ہوا؟ اور ذرا آگے چل کر اسی کے خاندان کے افراد دارا شکوہ اور اورنگ زیب عالمگیر سگے بھائی نہ تھے جو ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے؟

رہ گئی غزنویؒ اور غوریؒ کی بات تو وہ ایک خاص دور کی بات تھی اور اس نقطۂ نظر سے درست بھی تھی کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کروڑوں انسان بے انصافی اور ظلم و تشدد کا شکار تھے۔ ایک ناقص تمدنی اور فرسودہ سیاسی نظام نے انہیں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا اور وقت کا تقاضا تھا کہ آگے بڑھ کر اس بے انصافی اور ظلم کا خاتمہ کیا جائے' چنانچہ محمد بن قاسمؒ محمود غزنویؒ اور محمد غوریؒ نے یہ فرض ادا کیا اور اگر اس نقطۂ نظر کو نہ بھی تسلیم کیا جائے تو دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے کی فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ دین کی بقا اور ترویج کے لیے ایسے معرکے برپا ہوں۔ خاص ہندوستان میں برہمن ازم' جین مت اور بدھ ازم کے مابین شدید کشمکش رہی تھی اور یہ بالکل مذہبی اختلاف کے باعث برپا ہوئی تھی۔ بہرحال اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہندوؤں نے ہندوستان میں اپنی مذہبی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کو اپنے تحفظ کا خیال آیا' تاہم ان کا رویہ ہر لحاظ سے منصفانہ اور معقول تھا۔ وہ اگر اسلام کے احیا کی بات بھی کرتے تھے تو سب کے بھلے کے لیے۔ ان کا تصور بالکل یہ تھا کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی کل مخلوق امن اور آزادی کی زندگی گزارے۔ ان کے پیش نظر یہ بات ہرگز نہ تھی کہ یہاں ایسی حکومت قائم کریں جس میں ہندوؤں یا دیگر غیر مسلموں کی حالت ان کے غلاموں کی سی ہو۔ مسلمان کیا چاہتا تھا اور آزادی کا اس کے ذہن میں کیا مفہوم تھا؟ اس کا عکس موجودہ پاکستان میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں نہ بھارت کی طرح

فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے نہ کسی کی مذہبی آزادی سلب کی گئی۔

ہندو ذہنیت کے تاریخی شواہد:

خاص حالات میں خاص ذہن پیدا ہو جانے کے علاوہ دراصل ہندو قوم اور ہندو مذہب کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں عالمگیر انسانی برادری کا تصور موجود نہیں۔ ذات پات کا امتیاز ان کے ہاں ایک مُسلّمہ حقیقت ہے۔ وہ انسانوں کے درمیان اتنا فرق مانتے ہیں کہ اگر برہمن پر شودر کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ اس وقت تک پاک نہیں ہوتا جب تک غسل نہ کر لے۔ اسی طرح آبادی کا پھیلاؤ ایک محدود علاقے تک ہے۔ اگرچہ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے لیکن اس سے باہر ہندو بحیثیت قوم کہیں آباد نہیں۔ ان کے دھارمک زمانے میں تو سمندر عبور کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ پنڈت مالوی کے ذکر میں یہ بات آتی ہے کہ وہ گول میز کانفرنس لندن میں شریک ہوئے تو واپس آکر سمندر پار کرنے کا کفارہ ادا کیا۔ یقیناً یہ ساری باتیں ان لوگوں کے سامنے بھی تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے اس ملک میں رام راج قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ اس کی تدبیر انہوں نے یہ کی کہ اپنی پوری تاریخ میں پہلی بار اپنے تمدن اور مذہبی اصولوں میں تبدیلی لانے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو تحریک منظم ہوئی' وہ آریہ سماج تھی۔ اس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی نے 1875ء میں اس فرقے کی بنیاد رکھی اور اسلام کی عظمت کا اعتراف کیے بغیر اپنی قوم کو اسلام کے اصول اپنانے کی تلقین کی۔ مثلاً:۔

1- ہندو دھرم اب تک نسلی تھا' تبلیغی نہ تھا یعنی وہی شخص ہندو کہلا سکتا اور ہندو رہ سکتا تھا جو کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہو۔ پنڈت دیانند سرسوتی نے اس بات کی تلقین کی کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی ہندو دھرم میں شامل کیا جائے۔

2- ہندو مذہب میں شادی بیاہ کے مسائل خاصے گنجلک ہیں۔ شادی کا معاملہ یہ ہے کہ دو ایسے بچوں کی شادی بھی کر دی جاتی ہے جو ابھی پنگھوڑوں میں ہوں اور بیوہ ہو جانے کی صورت میں عورت کا مقدر یہ ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی نہیں

کر سکتی خواہ اس نے اپنے شوہر کی صورت بھی نہ دیکھی ہو۔ ظاہر ہے یہ اصول ایک صحت مند انسانی تمدن کے مطابق نہیں۔ پنڈت دیانند نے بچپن کی شادی کے خلاف آواز اٹھائی اور بیوہ کی دوسری شادی کرنے پر زور دیا۔

3- چھوت چھات کو ممنوع قرار دیا۔

4- بت پرستی جو ہندو مذہب کی خاص علامت ہے' اسے بھی چھوڑنے کا حکم دیا۔

5- ہندوؤں میں عورتوں کو تعلیم دینے کا رواج نہ تھا۔ انہوں نے تعلیم نسواں کو ضروری بتایا۔ غرض وہ ساری باتیں چھوڑنے پر زور دیا جن کے باعث ہندو بہت محدود ہو کر زندگی گزار رہے تھے اور وہ باتیں اختیار کرنے کی ہدایت کی جن سے نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

یہ تحریک یقیناً بہت اچھی تھی لیکن کچھ ہی آگے چل کر بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس کا رخ مسلمانوں کی مخالفت اور اسلام دشمنی کی طرف پھر گیا اور اس کی کوکھ سے ایسی خرابیوں نے جنم لیا کہ اس ملک کی تاریخ پر ان کے تباہ کن اثرات پڑے حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پنڈت جی اور ان کے چیلے اسلام اور مسلمانوں کے احسان مند ہوتے جن کی تقلید میں وہ روشنی کا سفر شروع کر رہے تھے لیکن انہوں نے پہلی بات یہ کی کہ شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے بانیوں نے یہ ضروری قرار دیا کہ جن ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا انہیں پھر ہندو بنایا جائے۔ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ اس ملک میں بسنے والے مسلمان ہندو بن جائیں اور اس پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں عرب اور ایران کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

دوسری تحریک سنگھٹن تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی فرقوں اور ذات پات کے مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہندوؤں کو اکٹھا کیا جائے اور یوں انہیں ایک غیر مفتوح طاقت بنا دیا جائے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان لوگوں کے خیالات کس قدر زہریلے تھے' اس کا اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکے گا جو پروفیسر محمد خلیل اللہ وائس پرنسپل اردو کالج' کراچی

کی کتاب ''تحریک پاکستان'' سے نقل کیے جا رہے ہیں۔

آریہ سماج تحریک شروع ہوئی تو اس کے ایک رہنما کنہیا لال نے لکھا: ''ہندوستانی بچے بت پرست بھی نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنے دھرم کے بچے ہوتے تو وہ مسلمانوں کی مسجدوں کو اس طرح مسمار کر دیتے جس طرح محمود غزنوی اور عالمگیر نے ان کے مندروں کو تباہ کر دیا تھا'' (صفحہ 158)۔

ایک اور ہندو رہنما ڈاکٹر مونجے نے کہا: ''جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے' فرانس فرانسیسیوں کا ہے' جرمن جرمنوں کا ہے' اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہندو منظم ہو جائیں تو وہ انگریزوں اور ان کے پٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہیے جو شدھی اور سنگھٹن کے سہارے پروان چڑھے گی۔ سنگھٹن کی تحریک کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط' متحد اور بیدار سیاسی جماعت کا قیام ہے جو ایک آزاد ہندو ملک کے قیام کے لیے مسلسل کوشش کرے گی۔ ہندو قومی مملکت کی بنیاد ہندو اداروں پر ہو گی مثلاً سنسکرت زبان' ہندو تاریخ' ہندو تہوار' ہندو سورماؤں کا احترام' ہندوؤں کے مقدس مقامات کا احترام اور ہندو تہذیب سے محبت وغیرہ۔

ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں جو بلاوجہ آزادیٔ ہند کی تحریک میں نیم عرب اور نیم ایرانی مسلمانوں کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ قومی مملکت اپنی قدیم قومی روایات اور اداروں کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور یہی عناصر مملکت کے باشندوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان تو محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں۔ ان کا مستقبل بس یہی ہے کہ وہ شدھی کی تحریک کے ذریعے ہندو مذہب میں شامل ہو جائیں''۔ (صفحہ 165-164)

یہ بیانات شاید مولانا ابوالکلام آزاد' رفیع احمد قدوائی' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ وغیرہ جیسے ان مسلم زعما نے بھی پڑھے ہوں گے جو ہندو مسلم اتحاد کو تمام باتوں پر فوقیت دیتے تھے اور شاید انہیں اس لیے غیر اہم قرار دیا ہو گا کہ یہ کھلے فرقہ پرست مہا سبھائیوں کی بڑ ہے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ صرف جن

سنگھیوں اور مہا سبھائیوں کی پریشان خیالی نہ تھی بلکہ ان مہا پرشوں کے دلوں کا بھی سب سے بڑا ارمان تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھارت ماتا کی دو آنکھیں بتاتے تھے۔

ہندو قائدین کی منافقت:

مسٹر گاندھی کو آسمانی مخلوق بلکہ مافوق الفطرت انسان کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ بات بہت اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کوشش اور خواہش میں وہ عام ہندوؤں سے ایک قدم بھی پیچھے نہ تھا کہ ہندوستان آزاد ہو تو اس کی سیاست اور تمدن پر ہندوؤں کا غلبہ ہو۔

گزشتہ سطور میں ان کی ہندی نوازی اور اس زبان کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا ذکر آ چکا ہے۔ یہاں صرف ایک اور ایسی بات کا حوالہ کافی ہوگا جس کا اثر ہندوستان کی سیاست پر بہت ہی گہرا پڑا اور وہ ہے کٹر فرقہ پرست اور مسلمانوں کے کھلے دشمن ہندوؤں مسٹر گاندھی اور دیگر کانگرسی لیڈروں کا میل جول اور تعاون۔ ان میں کچھ ہندو رہنما تو ایسے ہیں کہ انہوں نے ایک کٹر ہندو کی طرح صرف ہندو قوم کی بھلائی کے کاموں میں پوری زندگی گزاری لیکن وہ کانگرس کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل رہے۔ مثال کے طور پر لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ اور سردار ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ۔ اس ذہن کے ہندو لیڈروں سے مسٹر گاندھی کی ذہنی وابستگی کس درجے کی تھی، اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ شدھی کی تحریک کے بانی اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرنے اور اسلام کو وحشیوں کا مذہب قرار دینے والے سوامی شردھانند کو ان کی اس ناپاک جسارت کے جرم میں کہ انہوں نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی، ایک مسلمان نے قتل کر دیا تو مسٹر گاندھی نے اس پر سخت اظہار افسوس کیا اور یہاں تک کہہ گزرے کہ: ''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔'' (دیباچہ الجہاد فی الاسلام، صفحہ 18)۔

اس جملے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور غصے کا اظہار ہوتا ہے حالانکہ

اس سے زیادہ نفرت اور غصے کے مستحق وہ سوامی جی تھے جنہوں نے ہندوؤں کو اسلام اور ہادی اسلام ﷺ کے خلاف دریدہ دہنی پر اکسایا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے کیسی کیسی حرکتیں کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ صرف ان دو باتوں سے ہو سکتا ہے کہ لاہور کے ایک ہندو تاجر کتب راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے ایک انتہائی قابل مذمت کتاب شائع کی اور پلول ضلع گوڑگانواں کے ایک ہندو ڈاکٹر نے اپنے گدھے کا نام (خاکم بدہن) حضور نبی کریم ﷺ کے نام پر رکھا تھا۔ (یہ دونوں بھی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے)۔

منطقی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناعاقبت اندیش ہندو جب اس قسم کی مجنونانہ حرکتیں کر رہے تھے اور شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں شروع کر کے انہوں نے پورے ملک کی فضا کو زہر آلود کر دیا تھا تو مسٹر گاندھی نے کیوں چپ سادھ لی تھی؟ چاہیے تو یہ تھا کہ ''مہاتما جی'' اپنی قوم کو اس پاگل پن سے باز رکھنے کے لیے مرن برت رکھتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک یہ لوگ غلط ثابت نہ ہو جاتے اور پوری ہندو قوم اس بات کی قائل نہ ہو جاتی کہ نہ شدھی کی تحریک ان کے مفاد میں ہے نہ سنگھٹن کی۔ ہندوؤں کا حقیقی اور مستقل فائدہ تو اس بات میں ہے کہ ان کے بزرگوں نے امن اور شانتی کی جو تعلیم دی ہے' اسے اپنائیں۔ لیکن موصوف نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ غلط عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور پھر یہ حوصلہ افزائی اپنا دامن پھیلاتی چلی گئی۔

آزاد بھارت میں صداقت کا قتل عام:

یہ تو خیر ماضی کی باتیں ہیں۔ ضرورت تھی کہ آزاد بھارت کا نظم حکومت ایسی تمام خرابیوں سے پاک ہوتا مثلاً ہندو اپنے وعدے میں سچا ثابت ہوتا کہ بھارت ان تمام قوموں کا وطن ہے جو اس میں آباد ہیں لیکن افسوس کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ بھارتی رہنماؤں نے کہا تو یہی کہ بھارت سیکولر ملک ہے لیکن عملاً اسے ایک ہندو سٹیٹ ہی بنایا گیا اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ تو وہ معاملہ کیا جو کوئی شریف قوم کسی شریف قوم کے ساتھ نہیں کر سکتی۔

ہندو اکثریت نے آزادی کے پہلے دن سے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے شروع کیے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بلکہ اب تو اس بربریت میں اضافہ ہوا ہے کہ قرآن کی اشاعت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا گیا اور صدیوں سے آباد مسجدوں کے بارے میں یہ دعویٰ ہوا کہ اب انہیں مندروں میں تبدیل کر دینا چاہئے اور اقتصادی امور میں تو مسلمانوں کی یہ گت بنا دی گئی کہ اکثر باتوں میں بھارت کا شودر ان سے بہتر حالت میں ہے۔ تعلیمی اداروں میں اچھوتوں کے لیے سیٹیں مختص ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے نہیں۔ بھارت کو ایک ہندو ریاست بنانے کے لیے کانگرسی حکومت نے جو کارروائیاں کیں' وہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں مثلاً:۔

1- کانگرس کے آئین میں یہ بات درج تھی کہ قومی زبان کا نام ہندوستانی ہوگا (حوالہ پہلے دیا گیا ہے) لیکن آزادی ملی تو مسٹر گاندھی کی منشا یا منظوری سے قومی زبان کا درجہ ہندی زبان کو دیا گیا۔

2- قومی ترانہ ایک ایسے گیت کو بنایا گیا جو مسلم اقتدار کے دشمن ایک بنگالی ہندو نے اپنے ناول میں لکھا تھا۔ بنکم چیٹر جی کے اس ناول آنند مٹھ (خوشیوں کا مندر) میں بنگال کے کچھ لٹیرے بنگال کے مسلم حکمرانوں کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور کسی موقع پر یہ گیت گاتے ہیں۔ گیت میں عظمت وطن کا کیسا بھی تصور موجود ہو لیکن اس کی بنیاد بہر حال مسلمانوں سے نفرت پر رکھی گئی ہے۔ ضروری تھا اس جذبے کی تائید میں اس گیت کو قومی ترانہ نہ بنایا جاتا۔ بھارت میں بلند پایہ شاعر موجود تھے۔ وہ اپنے وطن کے شایان شان ترانہ لکھ سکتے تھے لیکن متعصب ہندو ذہن نے کھلے بندوں اپنا کام کیا۔

3- کانگرس کے ترنگے جھنڈے پر چرخے کا نشان تھا۔ یہ نشان خوشنمائی کے لحاظ سے بھی بہت موزوں تھا اور اس اعتبار سے بامعنی بھی تھا کہ چرخے نے آزادی ہند کی تحریک میں سب سے موثر ہتھیار کا کام دیا تھا لیکن آزاد بھارت نے اپنے جھنڈے پر ایک

ہندو مہاراجہ اشوک کا چکر پسند کیا اور اپنا تعلق قدیم دور اقتدار سے جوڑ دیا۔

4- بھارت میں عیسائیوں' مسلمانوں' سکھوں اور اچھوتوں کی بہت بڑی تعداد بستی ہے اور یہ گائے کو ہندوؤں کی طرح مقدس جانور نہیں مانتے۔ عیسائی اور مسلمان تو اس کا گوشت غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں' ضروری تھا کہ یہ بات زیر غور لائی جاتی اور آزاد بھارت میں ان قوموں کی آزادی کو محدود نہ کیا جاتا لیکن ہندو اکثریت نے اس معاملے میں بھی من مانی کی اور گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگا دی۔

ایسی باتوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر چند ایک لکھی گئی ہیں اور یقیناً انہی سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آل انڈیا کانگرس کے رہنماؤں نے بھی آزاد بھارت کو وہی روپ دیا جو اس ملک میں رام راج قائم کرنے والی فرقہ پرست ہندو جماعتوں کے پیش نظر تھا۔ یعنی اس ملک پر ہندوؤں کا حق فائق سمجھا اور انہیں بالا دست بنا دیا اور دوسروں کو ان کے ان حقوق سے بھی محروم کر دیا جو انہیں انگریزوں کی حکومت میں حاصل تھے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ آزاد بھارت میں ہندوؤں کے مذہبی حقوق کا تحفظ بھی ہونا چاہئے تھا لیکن عملاً ملک کو ایک ہندو ریاست بنا دینا کسی طرح بھی روا نہ تھا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ حکمران جماعت سیکولرازم کی دعویدار تھی اور ملک کے ہر باشندے کو ایک الگ قوم کا فرد تسلیم کرتی تھی۔ اگر بھارت کی اعلیٰ قیادت کا ذہن صاف ہوتا اور وہ اپنے وعدوں میں مخلص ہوتی تو یہ اصول اپناتی کہ ملک جس صورت میں بھی آزاد ہو رہا ہے اور اس میں بسنے والی قوموں اور برادریوں کی جو حیثیت بھی ہے' اسے جوں کا توں رکھا جائے گا بلکہ آزادی کی برکات سے ان کے حقوق کچھ اور نکھریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ہندو قوم نے ملک کو اپنی جاگیر خیال کیا اور سب کے حقوق پامال کر کے اپنے اختیارات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر لیا۔

فرقہ پرست ہندوؤں کے خواب کی تعبیر:

بھارتی حکومت کو تو اس بات پر اصرار ہے کہ اس نے اس ملک میں جمہوریت قائم کی

ہے اور ان کا نظام سیکولر ہے جس میں ہر شخص کو آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی سہولتیں حاصل ہیں لیکن حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ بھارت فرقہ پرست' متعصب اور ہندوؤں کے خواب کی تعبیر ہے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کے نام پر کانگریس حکومت نے وہ ساری باتیں پوری کردی ہیں جن کی مانگ کنہیالال' ڈاکٹر مونجے اور شام پرشادمکرجی وغیرہ نے کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:۔

"ہندوقومی مملکت کی بنیاد ہندو اداروں پر ہوگی۔ مثلاً سنسکرت زبان' ہندی زبان' ہندو تاریخ' ہندو تہوار' ہندو سورماؤں کا احترام' ہندوؤں کے مقدس مقامات کا احترام اور ہندو تہذیب سے محبت وغیرہ" (ڈاکٹر مونجے کے بیان کا اقتباس۔ بحوالہ تحریک پاکستان' صفحہ 162)۔ ان مطالبات میں سے کانگریس حکومت نے بیشتر آزادی کے ان برسوں میں پورے کردیے ہیں مثلاً:۔

1- ملک کی قومی زبان ہندی ہے اور سنسکرت کی ترقی اور ترویج کے لیے پوری کوشش کی جا رہی ہے۔
2- ہندو سورماؤں کا احترام اس طرح کیا گیا ہے کہ مہارانا پرتاپ اور سیوا جی مرہٹہ جیسے ہندوؤں کے بت بڑے شہروں کے چوراہوں اور سیر گاہوں پر نصب کرائے گئے ہیں جنہیں ہندوؤں کے سوا ہندوستان کا کوئی باشندہ قومی ہیرو نہیں مانتا۔
3- ہندوؤں کے مقدس مقامات کا احترام اس طرح کیا جا رہا ہے کہ مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کردینے کی مذموم کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کی ایک مثال بابری مسجد کی شہادت ہے۔
4- ہندو تہذیب سے محبت کا مظاہرہ اس طرح کیا جا رہا ہے کہ فلموں اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اسے انتہائی جاذب نظر انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور مسلم تہذیب کا باقاعدہ مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اگر گنجائش ہوتی تو ایسی بہت سی باتیں لکھی جاسکتی تھیں لیکن انہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ بھارت ایک ہندو ریاست ہے تو کیا کوئی

شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ جمہوری اور سیکولر روایات کے مطابق ہے؟

انجام کیا ہوگا؟

مستقبل کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن بھارت کے بارے میں یہ بات بہت اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک کی سیاست نے جس سفر کا آغاز کیا ہے' اس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ وجہ یہ کہ اس کی بنیاد ایک چھپے خوف (یہ خوف کہ مسلمان طاقتور ہوئے تو پھر بھارت پر اپنی حکومت قائم کر لیں گے) دوسروں سے نفرت اور توسیع پسندی پر ہے۔ بے شک ابھی تک یہ صورت ہے کہ اس ملک کو اپنی ایسی کوششوں میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ حیدر آباد دکن' گوا' کشمیر اور جونا گڑھ' مانگرول وغیرہ پر چالاکی اور جبر سے قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور اس نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی حسرت بھی پوری کر لی ہے بہر حال ہم ہندوستان کی اس ناپاک سازش کو بادل نخواستہ مان لیتے ہیں لیکن اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مشرقی پاکستان اگرچہ بنگلہ دیش بن چکا ہے لیکن نہ صرف دو قومی نظریہ زندہ و پائندہ ہے بلکہ بنگلہ دیشی مسلمانوں کا قومی تشخص زندۂ جاوید ہے کیونکہ اس کی بنیاد **"کلمۂ توحید"** ہے اور وہ تا قیامت زندہ ہے۔ نیز پاکستان کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈے میں بھی مصروف نظر آتا ہے کم از کم روس اور امریکہ کو اس نے گمراہ کر لیا ہے لیکن کاغذ کی یہ ہنڈیا زیادہ دیر آگ پر سلامت نہ رہے گی اور کاغذ کی یہ ناؤ زیادہ دیر پانی پر نہ تیر سکے گی۔

عالمی سیاست بند کمرے کا کھیل نہیں کہ اسے اپنے اصولوں پر جاری رکھا جا سکے۔ اس کے مستقبل کے فیصلے حقائق کی روشنی میں ہوتے ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ دنیا کی وہ بڑی طاقتیں جو ہر میدان میں ترقی یافتہ اور منظم ہیں اور جن کے اسلحہ خانے خوفناک ہتھیاروں سے اس حد تک لبریز ہو چکے ہیں کہ مزید ہتھیار محفوظ کرنے کی گنجائش نہیں رہی' وہ بھی ہندو سامراج کو اتنا بڑا بننے کا موقع نہ دیں گے کہ وہ ان کے منہ آ سکے۔ ان کی خاموشی اس وقت تک ہے جب تک بھارت اپنے پڑوسی ملکوں کو ہضم کرنے کی مجنونانہ کوشش سے ایشیا کو

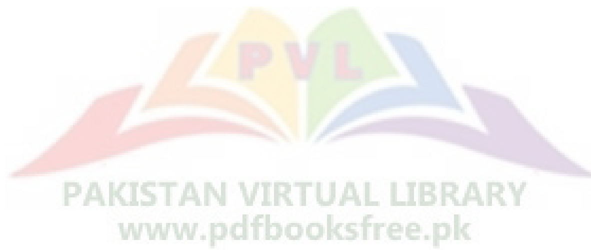
میدان جنگ بنانے میں ان کی مدد کر رہا ہے۔ جب یہ مقصد پورا ہو جائے گا تو ان کے ہتھیار غالباً سب سے زیادہ بھارت کی سرزمین پر آزمائے جائیں گے۔

علاوہ ازیں موجودہ دور کی ایک بہت بڑی ضرورت عالمی برادری میں تجارتی اثر و رسوخ حاصل کرنے کی بھی ہے اور یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ موجودہ راستے پر چلتے ہوئے بھارت دوسروں سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ بھارت کے پڑوسی شاید کچھ عرصہ اور یہ بات نہ سمجھ سکیں کہ وہ "مارے اور رونے نہ دے" کی پالیسی پر گامزن ہے اور اس کی اصل تہذیب جمہوریت نہیں بلکہ بت پرستوں کی تہذیب کا احیا ہے۔ تو لازمی طور پر لوگ اس سے نفرت کریں گے اور اس نفرت کے اثرات بہت دوررس ہوں گے۔

آخری بات یہ کہ ان سب باتوں کو مفروضہ اور بے اصل قرار دینے کے بعد بھی حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ سچ کو جھوٹ اور فریب کو صداقت ثابت کرنے کی کوشش آخری مرحلے تک بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کو ملیچھ، ضدی، ظالم اور انگریزوں کا پٹھو کہنا کھلا جھوٹ ہے بلکہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ۔ مسلمان بے عمل ضرور ہو چکے ہیں ان میں کمزور کردار کے لوگوں کے ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اصلاً وہ اس عالمگیر تحریک کے داعی ہیں جسے کامیاب کرنے کے لیے روئے زمین کے ہر حصے میں اللہ کے انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور ان کے ہم خیال مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ انگریزوں کے اکسانے پر نہیں بلکہ تنگ نظر ہندوؤں کے رویے کے جواب میں کیا تھا اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ فیصلہ ہر لحاظ سے درست تھا۔ یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مسلمان ہند نے پاکستان کا مطالبہ انگریزوں کے اکسانے پر کیا تھا یا یہ کہ قائداعظمؒ انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قائداعظمؒ اس پروپیگنڈے کی بار بار تردید کر چکے ہیں۔ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا: "پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال! یہ "اسلام کا بنیادی مطالبہ

تھا"[4]۔اب اپنی فلموں میں قائداعظمؒ کو ضدی اور گاندھی کو دیوتا دکھا کر اس سچائی پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔میرا خیال ہے ذی شعور ہندوؤں کو بھی اس بات پر ضرور غور کرنا چاہئے کہ ان کی موجودہ قیادت کس راستے پر چل رہی ہے۔

☆☆☆



حوالہ جات

1-ہندو مہا سبھا کے مشہور رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ۔
2- تحریک پاکستان ۔از پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب۔
3-ڈاکٹر مولوی عبدالحق ٬صدر کل ہند انجمن ترقی اردو جو آگے چل کر بابائے اردو کہلائے۔
4-قائداعظم کا پیغام طلباء کے نام مرتبہ محمد حنیف شاہد٬130